قومی تاریخ کے گم شدہ اوراق-ایک آپ بیتی کے تناظر میں

The Lost Pages of National History: In Perspective of an Auto Biography

ڈاکٹر انوار احمد *

Abstract:

Due to reasons best known to intellectuals and social scientists our text books and teachers are shy of Historic and political Consciousness. This is one of the reasons of popularity of memoirs of a progressive writer who was declared "outcast" or rebel. In this article an autobiography has been discussed which reveals the ordeals of conscious women folk who opted to struggle against the worst tyrant [1977-1988].This book has its literary merits but tries to retrieve those lost pages of our national history which were handed over to the furnace meant for "less healthy" material. Fueling of this furnace has been entrusted to those sycophants who have taken over as custodians of curriculum.

ہماری درسی کتاب، درس گاہ اور معلم کسی بھی تاریخی سچائی کے مقابل لرزہ براندام ہو جاتے ہیں کہ مردانِ آہن نے قانون اور انصاف کو ہی بازیچہ اطفال نہیں بنایا بلکہ، دستورِ پاکستان اور قوم کے اجتماعی مقاصد کے تعین کے سلسلے میں اپنے من چاہے ہدف تک پہنچنے کی جلدی میں ماضی کو اس کی تاریخیت سے بھی محروم کیا ہے جدید سیاسی تاریخ میں نیلسن منڈیلا کے دو کارنامے ہم ایسے ملکوں کے لئے روشن مثال بن سکتے تھے مگر افسوس ہمارے جرنیل، سیاست دان، جج، دانشور اور صحافی اس کا ذکر تو کرتے ہیں، مگر عمل نہیں کرتے۔ایک تو کُرسی کو اس وقت ہی چھوڑ دینا چاہیئے، جب آس پاس کھڑے خوشامدیوں کے علاوہ بعض 'مخلص' بھی یقین دلا رہے ہوں کہ آپ جیسا مقبول یا

* سابق سربراہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

معقول حاکم 'قوم' کے لئے ناگزیر ہے اور اسی منصب سے تاحیات چپکے رہ کر اور بھی ' قومی خدمت' کر سکتے ہیں اور دوسرے بشپ ٹوٹو کی سربراہی میں ایک کمیشن بنا کر سچے ' عیسائیوں' کو آمادہ کرنا کہ آؤ اپنے مذہب کی سب سے بڑی قوت یعنی اعترافِ خطا کا برملا اور بروقت اظہار کرو۔ سب کے سامنے آ کر کم از کم یہ تو تسلیم کرو کہ ہم نے نسل پرستی کو عقیدہ بنا کر کب اور کہاں، جنوبی افریقہ کے اصل وارثوں کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ منڈیلا کا خیال تھا کہ اس اعتراف کے بعد شاید گورے ظالم بھی مظلوم کالوں کے ساتھ اس وطن کے باشندے ہی نہیں، وارث بھی بن جائیں گے۔ ہمارے ہاں شاید ایک صدی کے بعد ہی کوئی ایسا معجزہ رونما ہو جائے، جب اقتدار کے کھیل کا کھلاڑی برملا کہے کہ میَں اپنی غلطی پر قوم سے معافی بھی مانگ رہا ہوں اور نصابی کتابیں لکھنے والے بھی کہیں کہ اس قوم کو سیاسی، سماجی اور تاریخی شعور سے محروم کرنے میں ہمارا کردار بھی طالع آزماؤں سے کم نہیں تھا۔ اس تناظر میں ان آپ بیتیوں کو توجہ سے پڑھا جا رہا ہے، جن کے لکھنے والوں نے آمرانہ دور کی سفاکی کے روبرو ایسی جدوجہد کی جو اس تاریخ جمہوریت میں بار پائے گی، جو ابھی لکھی جانی ہے۔ فرخندہ بخاری کی آپ بیتی ایسی ایک چشم کشا کتاب ہے، جو تاریخ کے 'گم شدہ صفحات' کی بازیابی میں مددگار ہوتی ہے مگر یہاں زیادہ ضروری ہے کہ پہلے کشور ناہید کی اس 'نوٹ بک' کے اقتباسات کو پس منظر کے طور پر بیان کیا جائے اور یہ بھی کہ بعض مجبوریاں 'سرکاری ملازموں' کو پورے اظہار سے روکتی ہیں، چاہے وہ سرکاری ملازم کشور ناہید جیسی بے دھڑک زندگی گذارتے ہوں اور اظہار کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ کشور لکھتی ہیں[نوٹ بک]:

> ''میرے دل کے آرکائیوز میں 65ءاور 71ء کی جنگ کے سارے زمانے ہیں۔ جب ایم۔آر۔ ڈی تحریک، پی۔این۔ اے کی تحریک چلی۔ مہناز رفیع اور شاہین حنیف رامے دوسری جانب ہوتی تھیں، عاصمہ اور ہم لوگ ایک طرف۔ سرکاری ملازمت کے باوجود جلوسوں اور جلسوں میں جانا، لکن چھپائی والا سلسلہ ہوتا تھا۔ جب ان جلوسوں کی تصویر اُتاری جانے لگتی تو میرے سارے دوست میرے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے تاکہ میں تصویر سے بچ جاؤں۔ حبیب جالب غصے میں آ کر کہتے۔ ''سرکاری نوکری کیوں کرتی ہو؟'' اور فیض صاحب جواب دیتے۔ ''یہ نہیں ہو گی تو کوئی اور جماعتی آن کر بیٹھ جائے گا۔''(۱)

> ''قدرت اللہ شہاب سے لے کر الطاف گوہر تک سب سرکار کے آئینہ گر تھے۔''(۲)

> ''[کوئی ادیب] کبھی میری کمر میں ہاتھ ڈالتے اور مجھے کیا ملتا، ساری رات کا مرثیہ۔ اس نے کیوں تمہیں چھوا؟ وہ کیوں تمہارے قریب کھڑا تھا؟ رات بھر جاگ کر دفتر پہنچنے پر میری سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر میر نسیم محمود حال پوچھتے۔''(۳)

''بھٹو صاحب وزیر خارجہ تھے۔ بھٹو صاحب نے میری پوری بات سنی، بولے۔ ''پیسے جتنے چاہئیں مجھ سے لے کر انہیں دے دو مگر میں امریکیوں سے بات نہیں کروں گا۔''[یوسف کامران پر جب ایک امریکی کمپنی کے ساتھ حساب فہمی کا معاملہ درپیش تھا،تب کشور کچھ دوستوں کے ساتھ تب کے پاکستانی وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو سے ملیں کہ امریکی وزیر خارجہ کو فون کر کے یوسف کی سفارش کریں۔''(۴)

''لاہور کے مارشل لاءایڈمنسٹریٹر جنرل نیازی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے گھر ان کے پاس جاؤں۔'' (۵)

''کوثر نیازی اپنی وزارت کے دوران کئی دفعہ ایڈیٹوریل ایک رجعت پسند اخبار کے لئے لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ چونکہ پیکٹ میرے دفتر کے ذریعہ ہی آتا تھا،اس لئے یہ بات سند ہے۔''(۶)

''میں نے پہلے ان [سلمیٰ تصدق] سے کہا۔ ''آپ پر اختر شیرانی نظمیں لکھا کرتے تھے، کوئی تصویر یا تحریر آپ کے پاس ہو تو دیں۔'' انہوں نے بڑھاپے میں بھی شرما کر کہا۔ ''چل ہٹ میرا کیا واسطہ۔''(۷)

''اس زمانے میں ماہِ نو کی قیمت دو روپے ہوتی تھی۔[بعض ڈھیٹ قسم کے مفت خورے] پانچ روپے خرچ کر کے پرچہ مفت لینے آتے تھے۔''(۸)

''شام کو بھٹو صاحب کا لابالی پن اور دوسری عورتوں سے تعلق کو [نصرت بھٹو] چپ کر کے سہتی رہیں۔ بینظیر میں بھی ماں کی طرح کا صبر تھا۔''(۹)

''پروین شاکر مجھ سے عمر میں چھوٹی اور شاعری میں بڑی تھی۔''(۱۰)

''[مسجدِ قرطبہ پہنچ کر] بیٹے کو کہا میں کھڑے کھڑے نفل پڑھوں گی تم میرے آگے کھڑے رہنا۔''(۱۱)

''ہمارے ساتھ ڈیوڈ ہیوز بھی بیٹھے تھے۔ یہ سلویا پلاتھ کے شوہر ہوا کرتے تھے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ ان کے باعث سلویا نے خودکشی کی تھی۔ مجھے یہ زہر لگتے تھے۔ میں نے جب کہا کہ آپ پوئٹ لارئیٹ ہیں مگر مجھے سلویا بھی پسند تھی اور ہے، تو چڑ گئے۔''(۱۲)

''پتہ چلا جیسے چواین لائی اور روس میں لینن کو سرکاری طور پر عزت نہیں دی جاتی ہے مگر غیر ملکی قطاریں، ان تینوں جگہوں پر ٹوٹتی ہی نہیں تھیں۔''(۱۳)

''اصغر ندیم سیّد اور شیبا کے علاوہ میری دونوں بیٹیوں بینا اور فاطمہ کی محبتیں کہ جو مجھے فرزانہ کو بھولنے نہیں دیتی ہیں۔''(۱۴)

''صحافت میں میرے ہیرو دو اشخاص تھے اور اب تک ہیں۔ نثار عثمانی اور منہاج برنا۔ برنا صاحب کی نوکری بھی ختم ہو گئی۔ بینظیر کے دوسرے دورِ حکومت میں انہیں آسٹریلیا لگا دیا گیا۔ بیگم کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ پاکستان آ کر ان کا انتقال ہو گیا۔ ضمیر نیازی وہ شخصیت تھے کہ جن سے ملنے کو بار بار

بینظیر جاتیں اور اصرار کرتیں کہ حکومت کو کچھ خدمت کا موقع دیں۔ وہ ہر دفعہ انکار کرتے ہوئے کہتے۔ ''انسان کی ضرورت دو جوڑی کپڑے ہوتے ہیں وہ میرے پاس ہیں۔''(۱۵)

''کبھی کبھی بڑے بیٹے کے منہ سے نکل جاتا۔ ''اماں آپ مریں گی تو ہم امیر ہو جائیں گے۔'' میں مرنے کا سوچتی تو سو سکینڈل سامنے آن کھڑے ہوتے، جینے کا سوچتی تو بچوں کی ڈیمانڈ کہتی چیک بک نکالو۔''(۱۶)

''رات کے دو بجے تک [بے نظیر کے لئے] سیاست سیاست کھیلنا، صبح ایک کالا بکرا صدقے دینا، تاج حیدر کو بلاول کو اردو سکھانے پہ لگانا۔''(۱۷)

حالانکہ اس 'نوٹ بک' سے پہلے کشور ناہید [پ ۱۹۴۰] کی 'ایک بری عورت کی کتھا' لکھی اور پڑھی گئی، مگر یہ مختصر کتاب کئی اہم سوال چھوڑ گئے کہ ہمارے ہاں تاریخ کے اوراق کیسے گم کئے گئے اور کیا ان کی بازیابی کی کوئی صورت ہے؟ اسی طرح توصیف تبسم، ش، فرخ یادگیر خواتین کی آپ بیتیوں میں بھی سیاسی شعور کی جھلکیاں ہیں، کچھ ذاتی زندگی کی کسک بھی، مگر شاید فرخندہ بخاری جیسی متحرک سیاسی زندگی کسی خاتون اہلِ قلم نے نہیں گذاری۔

نامور شاعر شہرت بخاری نے [۱۹۲۵-۲۰۰۱] جب اپنی آپ بیتی 'کھوے ہوؤں کی جستجو' [سنگ میل لاہور ۲۰۰۲] لکھی تھی تو اس میں والہانہ سرشاری کے ساتھ اپنی بیوی فرخندہ بخاری کا ذکر کیا تھا اور انھیں حاصل حیات قرار دیا تھا۔ ان کے یہ جملے ہم ایسے نیم آزردہ شوہروں کے لیے قابل رشک کم اور موجب حسد زیادہ تھے اور پھر اس کتاب کی اشاعت کے بعد خبریں آنا شروع ہو گئیں کہ دونوں میاں بیوی کی داخلی تلخی اور کشیدگی گھر سے باہر آگئی ہے اور کسی قدر نیم علیحدگی ہو گئی ہے تب یہ خیال کیا گیا تھا کہ انسان کو اپنی آپ بیتی مکمل کرتے وقت اور اپنے بعض قریبی احباب کو خراج تحسین پیش کرتے وقت محتاط ہونا چاہیے کہ کہیں کلماتِ تحسین پر نظر ثانی نہ کرنی پڑ جائے۔

ضیا الحق [دورِ اقتدار ۱۹۷۷-۱۹۸۸] سے بھی پہلے دو ڈکٹیٹر پاکستان کے حکمرانِ مطلق رہے تھے مگر پاکستان کو منشیات، کلاشنکوف، متشددانہ مذہبیت اور ریاکاری کی طرف دھکیلنے میں جو کردار ضیا کا ہے، وہ اب اس کے سرکاری حاشیہ نشیں بھی ماننے لگے ہیں۔ اسی کے دور میں باضمیر اہلِ قلم کے لئے مارچ ۱۹۸۱ قید و بند اور جلاوطنی کا پیغام لایا، اسی لئے پاکستان کی سیاسی تاریخ کا بھی ایک اہم مہینہ ہے جب پی آئی اے کا طیارہ ہائی جیک کر کے کابل لے جایا گیا تھا اور جہاز اغوا کرنے والوں کے مطالبے پر ۵۳ سیاسی قیدیوں کو دمشق منتقل کیا گیا تھا۔ ان میں ایک خاتون فرخندہ بخاری بھی تھیں جسے ہتھکڑیوں میں جہاز پر سوار کیا گیا تھا۔ تاہم بے نظیر بھٹو کے دونوں ادوار حکومت میں یہ خاتون کسی اہم عہدے پر متمکن ہوئی اور نہ کسی منتخب ایوان کی زینت بنی، حتیٰ کہ یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم تھے اور

آصف علی زرداری صدر تب بھی کسی سرکاری اعزاز کے قابل انہیں خیال نہیں کیا گیا۔اس اعتبار سے فرخندہ بخاری کی آپ بیتی 'یہ بازی عشق کی بازی ہے[سنگِ میل، لاہور ۲۰۱۲]' بعض تاریخی تصاویر اور دستاویزات کے ساتھ شاہد محمود ندیم کے دیباچے کے ساتھ ایک اچھے ادارے کے ذوق طباعت سے آراستہ ہو کر شائع ہوئی ہے تو میں نے پاکستان کی تاریخِ جمہوریت کے اس اہم کردار کی شخصیت کو اس کی اپنی آپ بیتی کے ذریعے دریافت کرنے کی کوشش کی اور احساس ہوا کہ بنیادی طور پر اس کے بچپن کا ایک واقعہ اس کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جب لاہور میں تھانہ ٹبی سے باہر سکھوں اور مسلمانوں کا فساد اس علاقے میں ہوا یہاں فرخندہ کے نو عمر بھائی اپنے ہم جولیوں کے ساتھ کھیلنے گئے تھے اور اب گھر کے بڑے بوڑھے ان کی سلامتی کی دعائیں کر رہے تھے اور پولیس انھیں فساد زدہ علاقے میں جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔اس وقت ایک چھوٹی سی لڑکی بھاگتی ہوئی اس علاقے میں گھس گئی اور آوازیں دے دے کر اپنے بھائیوں کو وہاں سے لے آئی۔ یہ فرخندہ بخاری کی نڈر مگر قربانیاں دینے والی ذات کی بنیادی طاقت ہے۔ پھر اس کی شخصیت کا ایک اور روپ سامنے آتا ہے جب اس کی بڑی بہن کو ٹیوشن پڑھانے ایک بڑی عمر کا شاعر پروفیسر گھر میں آتا ہے اور اسے بھی اصلاح سخن یا اصلاح ذات کے لیے مشورے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ پروفیسر ایک روشن خیال شاعر ہے، شیعہ ہے اور اپنی کمزور صحت کے باوجود بڑی گرم جوشی سے اس کا طلب گار ہوتا ہے اور یہ لڑکی اس تجویز کی حمایت ایسی استقامت سے کرتی ہے جس کی توقع اس کے افراد خانہ نہیں کر رہے ہوتے۔ بہر طور وہ یہ معرکہ سر کرتی ہے تب شہرت بخاری کا ایک اور روپ سامنے آتا ہے جو ان کی روشن خیالی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ وہ اسے شادی کے بعد برقعہ پہناتے ہیں اور اس کی کشش اور جاذبیت کو صرف اپنے تک مرتکز کرنے کی وہ ساری کوششیں کرتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں کسی خوبرو خاتون کا کوئی بھی شوہر کرتا ہے۔ تاہم وہ اپنے سیاسی لگاؤ کے سبب ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل کے ابتدائی مرحلے میں فرخندہ کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ ان کے قائد کی جان بچانے کے لیے سیاسی مہم کا آغاز کر سکیں،اس وقت پاکستان میں عام احساس یہ تھا کہ فلسطین کے یاسر عرفات، شام کے حافظ الاسد اور لیبیا کے کرنل قذافی بھٹو کے عدالتی قتل کو روک سکتے ہیں، چنانچہ عالمی سطح پر بعض پاکستانی ورکرز اور اہلِ قلم نے ایک تحریک چلائی، کوڑے کھائے، قید و بند سے گذرے، جلاوطنی اختیار کی۔انہی میں سے ایک فرخندہ بخاری تھیں۔ ان کی حیرت انگیز کتاب سے چند اقتباسات ملاحظہ کے جے:

....''واپسی پر پھر ٹبی تھانے کے پاس سے گزرے پولیس نے روک لیا تب میں نے سپاہیوں سے چلا کر کہا کہ بزدلو، اگر میں نہ جاتی تو تم میرے بھائی کبھی واپس نہ لا سکتے، پولیس والے حیران بھی تھے اور خوش ہو کر میرے

شانوں پر تھپکی دی.... میں بھائیوں کو بچالائی تھی۔ بھائیوں کو ساتھ لیے لیے گھر پہنچی تو اباجی نے انتہائی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے، کہا" یہ میری بیٹی نہیں بیٹا ہے۔ "[۱۸] .... مجھے پتنگ اڑانے کا شوق شروع سے تھا۔.... میں اپنی بہنوں کے بجائے بھائیوں کے زیادہ قریب تھی۔ جو کھیل وہ کھیلتے میں بھی وہی کھیلنے کی کوشش کرتی۔ وہ ورزش کرتے، میں بھی ورزش کرتی۔ وہ گلی ڈنڈا کھیلتے میں بھی وہی کھیلتی۔ وہ کرکٹ کھیلتے میں بھی کرکٹ کھیلتی۔[۱۹] .... میں نے اباجی سے شیعہ مسلک اور غربت کے بارے میں جوش میں بڑا مکالمہ کیا ساری صورتِ حال ایسی انہونی تھی جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ مجھے غریب لوگ اچھے لگتے ہیں، مجھے فنکار، شاعر ادیب لوگ اچھے لگتے ہیں، مجھے شیعہ بھی اچھے لگتے ہیں بلکہ مجھے لگتا ہے کہ میں خود شیعہ ہوگئی ہوں۔.... ہم کہاں کے رئیس ہیں۔ میرے نزدیک اردو سپیکنگ، شیعہ اور غریب ہونا کوئی جرم نہیں! اور آخر میں کہہ دیا اباجی مجھے افسوس ہورہا ہے کہ آپ کے قول اور فعل میں تضاد ہے.... [۲۰] .... جب وہ باجی کو پڑھانے آیا کرتے تھے لیکن ان سے کبھی بات نہیں کی تھی غزلوں پر اصلاح ضرور لی تھی وہ بھی باجی کے سامنے۔ پھر کہنے لگے تمہیں معلوم ہے وہ ایک معمولی حیثیت کا ایک غریب شاعر ہے۔ کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ ایک بہن ہے۔ وہ تمہیں کیا خوش رکھ سکے گا۔ بھوکا رکھے گا؟ اور ہمارے خاندان میں شیعہ مسلک اور اُردو بولنے والوں سے آج تک کوئی شادی نہیں ہوئی۔ تم عمر میں اس سے بہت چھوٹی ہو۔ کم از کم ۱۶ سال.... مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم اس کے ساتھ ہر گز خوش نہ رہ سکو گی اور میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ تم جو دیکھ رہی ہو اور جہاں تک دیکھ رہی ہو۔ میں اس سے بہت آگے دور تک دیکھ رہا ہوں۔ وہ لوگ اردو سپیکنگ ہیں ہمارے اور ان کے کلچر میں بہت فرق ہے۔ کیا تم پسند کرو گی کہ تمہاری شادی ایک شیعہ، غریب، اُردو سپیکنگ خاندان کے شاعر سے کردی جائے؟۔ یہ درست ہے ہم سیدوں کی عزت کرتے ہیں مگر شیعہ سے شادی نہیں کرتے.... اور اگر میں تمہاری بات مان لوں تو میری صرف ایک شرط ہے کہ تم شادی کے بعد کبھی بھی اور کسی بھی قسم کی شکایت نہیں کرو گی۔ وعدہ کرو کہ ہر حال میں تمہیں ایڈجسٹ کرنا ہوگا.... میں چپ رہی انھوں نے کہا زبان سے کہو میں نے کہا ٹھیک ہے.... [۲۱] .... ایک دن شہرت ایک پنجرہ جس میں بے حد خوبصورت آسٹریلوی طوطا تھا لائے اور کہا کہ یہ تمہارا گفٹ ہے اور باقی چار پانچ پلاسٹک کے پنجرے انھوں نے دو کھڑکیوں اور ایک دروازے پر لٹکا دیئے۔[۲۲] .... میں تمہارا باہر جانا پسند نہیں کرتا۔ تم جتنا چاہو پڑھو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن تم پرائیویٹ پڑھو۔ کالج نہیں جانا.... میں سخت مایوس تھی میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ شہرت اتنے پرانے خیالات کے ہوں گے۔ [۲۳] .... شہرت کے پاس چار پانچ لڑکیاں اُردو پڑھنے آیا کرتی تھیں۔ شروع شروع میں تو میں چپ رہی لیکن اب مجھے بھی غصہ تھا ایک دن دل کڑا کر کے میں نے ان لڑکیوں سے کہا اردو کوئی مضمون ہے جس کے لئے

تم روزانہ یہاں آجاتی ہو۔ ابھی اٹھو اور چلی جاؤ آئندہ کبھی میرے گھر نہ آنا اور شہرت ہکا بکا میرا منہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے اسلم کا بدلہ لے لیا تھا۔ اور وہ سب چلی گئیں۔[۲۴] .... شہرت کو سمجھ آگئی کہ میں کوئی موم کی گڑیا نہیں ہوں جیسا چاہا ویسے موڑ لیا اور میں نے یہ بھی بتا دیا کہ میں یہ پابندیاں برداشت نہیں کر سکتی میں انسان ہوں پرندہ یا موم کی گڑیا نہیں ہوں اگر آپ کو اپنا طرزِ زندگی پیارا ہے تو مجھے اپنا۔ خیر انھوں نے سمجھ لیا کہ اس طرح میں گزارا نہیں کر سکتی اور آہستہ آہستہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی حدود کو سمجھ کر قبول کر لیا۔[۲۵] .... مگر مذہبی اجارہ داروں، تجارتی اور صنعتی سرمایہ داروں اور اللہ کی زمین پر بنے فرعون نما، زمینداروں، وڈیروں اور جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ عالمی سرمایہ داری اور سامراج نے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف درپردہ ایکا کر لیا .... [۲۶] ....تاہم تحریک پیسوں سے چلتی ہے اور ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سب سے پہلے بیگم خاکوانی کے پاس گئے تھے مگر انھوں نے کہا یہ پارٹی کی لائن نہیں ہے اس لیے فنڈ نہیں مل سکتے۔[۲۷] .... میں اکھڑ چکی تھی میں نے کہا کہ میں نہ آپ کو نہ آپ کی بہن [ڈاکٹر کنیز یوسف] کو جانتی ہوں اس لیے مجھے اسی پاسپورٹ پر واپس پاکستان بھیج دیا جائے۔ عثمان نے کہا '' آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، ہمارا پروگرام لیبیا میں لیکچر دینے کا ہے ہم وہاں سے ایک ہفتے کے بعد پاکستان چلے جائیں گے۔ [۲۸] .... پتہ نہیں منصور شیخ نے، کس کے کہنے پر، کسی عناد کی بنا پر یا کسی بڑے منصوبے کے تحت، اپنی خالہ کے ذریعے ہمارے گھر پیغام پہنچا دیا کہ فندی سیر کرنے پیرس گئی ہوئی ہے۔ شہرت میرے بارے میں ہمیشہ ہی بہت حساس رہے ہیں، بھائی افتخار بھی بار بار پوچھتے فندی کہاں ہے، شہرت کہتے کراچی گئی ہے لیکن ایک دن انھیں یقین ہو گیا کہ میں ترکی وغیرہ کی طرف نکل گئی ہوں۔ [۲۹] .... رات کی فلائٹ سے ہم لاہور پہنچے۔ ڈیڑھ دو بجے کا وقت تھا۔ .... مجھے اچانک دیکھ کر سبھی بہت خوش ہوئے مگر شہرت نے خاص لہجے میں کہا '' کر لیں سیریں، دیکھ لیا پیرس۔؟ '' میں نے کہا کیسا پیرس اور کیسی سیر ؟.... مگر شہرت کا پارہ چڑھتا گیا، میں نے کہا اگر پیرس گئی تھی تو پاسپورٹ پر کچھ مہریں بھی ہوں گی، وہ دیکھ لو.... شہرت نے پاسپورٹ دیکھے بغیر پھاڑ دیا اور ٹکٹ بھی.... شہرت بھول گئے کہ میں انہی کی مرضی سے گئی تھی بلکہ وہ مجھے بھیجنے والے تھے.... شہرت نے یہاں تک کہہ دیا کہ میرے گھر سے نکل جاؤ.... میں کہتی رہی میری بات تو سن لو مگر وہ حد سے باہر.... بیٹیاں درمیان میں آگئیں.... بیٹے علی جی نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا.... میں کیا کرتی۔ اوپر والی منزل میں چلی گئی اور تھوڑا بہت قصہ ان کو سنایا کہ میں تو ایک خوفناک عذاب سے گزر کر آئی ہوں.... صرف ایک رات عثمان خالد کے گھر گزاری ہے اور وہ بھی اس لیے کہ اکی بھائی گھر پر نہیں تھے.... میں کہاں جاتی ؟۔[۳۰] .... '' وہ بڑے خفیف ہو رہے تھے وہ جان بوجھ کر میرے سامنے سگریٹ پیتے اور اس کا دھواں میرے منہ پر پھینکتے.... یہ بھی کسی عورت کے لیے تشدد سے کم نہیں ہوتا۔ میں نے ان سے کانسٹیبل

عورتوں کی شکایت کی کہ یہ میری انگلیوں کو مروڑتی ہیں، پٹاخے بجاتی ہیں، مجھے مارتی ہیں اور میرے کپڑے اتارنے کی کوشش کرتی ہیں انتہائی نازیبا حرکات کرتی ہیں۔ کیا یہی آپ کی ہدایت ہے ؟ یہ سنتے ہی ایک باوردی جوان نے میرا ہاتھ پکڑا اپنی طرف کھینچا اور سلگتا ہوا سگریٹ میری کلائی پر رکھ دیا۔....مجھے شدید دکھ ہوا، غصہ بھی آیا اور میں نے دوسری کلائی اس کے آگے رکھ دی۔ اس نے اس پر بھی سلگتا ہوا سگریٹ رکھ دیا مگر اس مرتبہ میں نہ چیخی نہ میں نے کلائی ہٹائی اور جب تک سگریٹ بجھا نہیں اس نے بھی اسے اٹھایا نہیں''۔[۳۱]....اتوار کو عبادت کا وقت بتایا سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا Don't Worry my Child , God will look after you. اور میں رو پڑی ابھی تک کسی نے بھی اس طرح سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا کوئی تسلی دینے والا نہیں، کوئی غم سننے والا نہیں، کوئی پہچاننے والا نہیں یہ کیسا نگر ہے یہ کیسی دنیا ہے کوئی تو ہو جو کہے کہ تم آگ کا دریا پار کر کے آئی ہو۔ تھوڑی دیر ہمارے ساتھ گزارو ہم تم بے گھروں کی بپتا سنیں گے۔ کوئی نہیں ہم جس کے پیروکار تھے اسے تو پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہمارا سورج تو غروب ہو چکا تھا لوگ چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں ڈوبنے والوں کا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ ہم جیسے دیوانے کئی اور بھی تھے جو اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے۔[۳۲]....ان کو بس میں بٹھا کر واپس آ رہے تھے کہ گرجے کی دیوار کے ساتھ ایک لڑکا لڑکی کافی قریب کھڑے تھے۔ ہم تو انھیں سرسری طور پر دیکھتے ہوئے گزر گئے لیکن شہرت وہاں لمحہ بھر کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس نوجوان کے ہاتھ میں ہیلمٹ تھا۔ اس نے شہرت کے سر پر مارا خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ میں نے اپنی دونوں بیٹیوں سے کہا بھاگو اور شہرت کو گھسیٹ کر چرچ کے اندر لے گئے۔ وہ نوجوان خون کو دیکھ کر وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ چرچ والوں نے پٹی تو باندھ دی لیکن ایمبولینس بلا کر ہسپتال لے گئے ٹانکے لگے اور ہم نے شہرت سے کہا کہ آپ بھلا ان کا نظارہ کیوں کرنے کھڑے ہو گئے تھے۔ [۳۳]....گھر میں شہرت اور میں تھے۔ دوپہر کے بعد مجھے ایمنیسٹی کے کچھ کاغذات پہنچانے جانا تھا۔ دروازہ بجا میں نے کھولا، کیا دیکھتی ہوں کہ بے نظیر اور یاسمین پھول لیے کھڑے ہیں میں مارے خوشی کے پاگل ہو گئی ہکا بکا کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔....پھر کہا وہ لال دال گھر میں ہے ؟ میں نے کہا جی....جی 'جلد سے پندرہ منٹ میں دال چاؤل پکاؤ 'میں نے دونوں چولہے جلا کر پندرہ منٹ میں دال چاول تیار کیے، کھا کر بہت خوش ہوئیں اور کہا تم تو بہت اچھا پکا لیتی ہو۔[۳۴]....ایک باوردی جوان سے میں نے پوچھا کہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو ؟ اس نے کہا معلوم نہیں، میں نے کہا کہ تمہاری عمر کا میرا بیٹا ہے۔ اسکا نام علی جی ہے۔ تمہارا نام کیا ہے ؟ اس نے کہا علی جی ! اور اس نے دوسرے سے کہا کہ خاتون کے ہاتھ اور آنکھیں کھول دو۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں لیکن وہ کہنے لگا کہ ائیر پورٹ کے پاس پہنچ کر مجھے دوبارہ آپ کے ہاتھ اور آنکھیں باندھنی ہوں گی۔ اس کے پاس پانی کی بوتل تھی کہا پانی پی لیں۔ اور وہ زار و قطار رو رہا تھا۔[۳۵] ....''ایک خوفزدہ کرنے والا

معاشرہ ایک مہذب معاشرہ نہیں ہوتا۔ مہذب کے معنی ہیں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور معاشرہ وہ ہوتا ہے جس نے قوم کے خصوصی جذبہ کی شناخت کرلی ہو۔ جس نے ماضی حال سے مذہب اور سائنس سے جدیدیت اور تصوف سے مادیت اور روحانیت سے سمجھوتہ کرلیا ہو۔ ایسا معاشرہ ہے جان و خلفشار سے پاک ہو اور ثقافت سے مالا مال ہوتا ہے''۔ (۳۶) .... '' کبھی کبھی ایک مقبول فیصلہ بالآخر عوام کے لیے مفید نہیں ہوا کرتا ہے نہ تو عملیت کا نظریہ اور نہ ہی عوامی مقبولیت کا نظریہ بنیادی تو سیاسی اور سماجی و اقتصادی اصول ہیں''۔ (۳۷) .... ''یہاں اسلام کی تاریخ جذبات میں تموج پیدا کرتی ہے اس قدر کسی اور ملک میں نہیں کرتی''۔ (۳۸) .... '' مگر ہمارے ملک کو آمریت کینسر کی طرح کھا گئی کلاشنکوف، ہیروئن، کرپشن، دہشت گردی سب آمروں کے تحفے ہیں''۔ (۳۹) .... '' غریب بھی بے زبان ہوتے ہیں خاص کر جب وہ راہنما جنھوں نے ان کو بولنا سکھایا ہو، ان کو شہید کر دیا گیا ہو''۔ (۴۰).... ہمارے معاشرے میں بہت سی ناانصافیاں اس لئے روا رکھی جاتی ہیں کہ 'عورت اپنی عزت کی خاطر چُپ رہے گی'، یہ کتاب اس مفروضے کو پاش پاش کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ لکھنے والی کی توقیر بڑھاتی ہے، ایسی آپ بیتیاں تاریخ کی گواہیاں ہیں، وہ تاریخ جسے نصاب اور درس گاہ تک پہنچنے میں کم از کم ایک صدی اور لگے گی۔

حوالہ جات

۱۔ کشور ناہید، 'نوٹ بک' [ایک مختصر خود نوشت]، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۱، ص: ۲۴

۲۔ ایضاً، ص: ۷

۳۔ ایضاً، ص: ۱۷

۴۔ ایضاً، ص: ۱۷

۵۔ ایضاً، ص: ۱۸

۶۔ ایضاً، ص: ۲۸

۷۔ ایضاً، ص: ۳۰

۸۔ ایضاً، ص: ۳۱

۹۔ ایضاً، ص: ۵۲

۱۰۔ ایضاً، ص: ۵۸

۱۱۔ ایضاً، ص: ۶۵

۱۲۔ ایضاً، ص: ۶۶

۱۳۔ ایضاً، ص: ۶۶

۱۴۔ ایضاً، ص: ۶۸

۱۵۔ ایضاً، ص: ۶۹

۱۶۔ ایضاً، ص: ۸۲

۱۷۔ ایضاً، ص: ۹۱

۱۸۔ فرخندہ بخاری، 'یہ بازی عشق کی بازی ہے' (خود نوشت)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۵

۱۹۔ ایضاً، ص: ۱۹

۲۰۔ ایضاً، ص: ۲۴

۲۱۔ ایضاً، ص: ۴۴

۲۲۔ ایضاً، ص: ۴۸

۲۳۔ ایضاً، ص: ۴۹

۲۴۔ ایضاً، ص:۵۱

۲۵۔ ایضاً، ص:۵۱

۲۶۔ ایضاً، ص:۶۰

۲۷۔ ایضاً، ص:۷۰

۲۸۔ ایضاً، ص:۸۹

۲۹۔ ایضاً، ص:۹۳

۳۱۔ ایضاً، ص:۱۰۱

۳۲۔ ایضاً، ص:۱۴۲

۳۳۔ ایضاً، ص:۱۵۰

۳۴۔ ایضاً، ص:۱۵۴

۳۵۔ ایضاً، ص:۱۶۵

۳۶۔ ایضاً، ص:۲۴۶

۳۷۔ ایضاً، ص:۲۴۷

۳۸۔ ایضاً، ص:۲۴۸

۳۹۔ ایضاً، ص:۲۶۲

۴۰۔ ایضاً، ص:۲۶۵